(غلام گردش)

دس ہزار جونکیں!

فرانس کا بادشاہ چودھواں لوئی (Louis XIV) پیرس میں شاہی کمرے میں حد درجہ پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ بظاہر اسکی حکومت حد درجہ مضبوط اور طاقتور تھی۔ مگر لوئی کو اسکے ہرکارے بار بار مطلع کر رہے تھے کہ بادشاہ کے اقتدار کے خلاف مسلسل سازش ہو رہی ہے۔ یہ کوئی عام آدمی نہیں، بلکہ لوئی کے اپنے درباری مصاحبین تھے جو اسکے خلاف ہر وقت ریشہ دارنیوں میں مصروف کار تھے۔ بادشاہ ہر طریقے سے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ کئی بار لگتا تھا کہ اسکا اقتدار ایک دم ختم ہو جائیگا۔ یہ انقلاب فرانس سے تقریباً ایک صدی پہلے کا قصہ ہے۔ ویسے بادشاہ عوامی انقلاب کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ درباری سازشوں سے بچنے کیلئے لوئی نے ایک حیرت انگیز فیصلہ کیا۔ پیرس سے بارہ میل دور، اسکے آباؤ اجداد نے شکارگاہ کے نزدیک ایک ہٹ بنوائی ہوئی تھی۔ شکار کے دوران تمام شاہی خاندان وہاں آرام کرتا تھا۔ لوئی نے وہاں دنیا کا سب سے بڑا محل بنوانے کا فیصلہ کیا۔ جسے پیلس آف ورسائلز کہا جاتا ہے۔ اسکے دو مقصد تھے۔ ایک تو بادشاہ، عوام کی نظر سے تھوڑا سا دور رہیگا۔ اسطرح عام لوگوں کو اسکی شاہانہ رہن سہن کے متعلق معلومات نہیں ہونگیں۔ دوسرا نکتہ حد درجہ سیاسی تھا۔ درباری اور انکے تمام اہل خانہ اس محل میں بادشاہ کے ساتھ رہینگے۔ اسے علم تھا کہ اپنے دوستوں کو تو نزدیک رکھنا چاہیے مگر اپنے دشمنوں کو مزید نزدیک تر رکھنا چاہیے۔ لوئی کا خیال تھا کہ درباریوں کی اکثریت اسکی نظروں کے سامنے رہیگی، تو انکی منفی حرکات کو جانچنے اور انہیں ناکام بنانے کا بروقت انتظام ہوتا رہیگا۔ چنانچہ بادشاہ نے شاہی خزانے کے تمام وسائل، دنیا کے مہنگے ترین محل بنانے کیلئے مختص کر دیے۔ یہ 1661 کا زمانہ تھا۔ دنیا کے بہترین آرکیٹکٹ Robert decotta، Jules Mansart وغیر کی خدمات لی گئیں۔ باغات بنانے کیلئے نامور آرٹسٹ Andrea Notre کی صلاحیتوں کو مستعار لیا گیا۔ تین سے چار دہائیوں کی محنت کے بعد دنیا کی وہ شاہانہ عمارت سامنے آئی، جسے دیکھ دیگر بادشاہ بھی ورطہ حیرت میں ڈوب جاتے تھے۔ بتیس سو کمروں پر یہ مشتمل محل آج بھی دنیا کی قیمتی اور خوبصورت ترین عمارت ہے۔ بادشاہ لوئی XIV شاہانہ کروفر کے ساتھ محل میں درباریوں سمیت منتقل ہو گیا۔ شاہی خاندان کے علاوہ دس ہزار درباری بھی اب شاہی قافلہ میں ہر دم شامل تھے۔ لوئی نے انکو شکار، بہترین شراب اور عیش و عشرت پر لگا دیا تھا۔ اب ہر وقت عیاشی در عیاشی کا سماں تھا۔

مگر بادشاہ ایک چیز بھول چکا تھا۔ اس شاہانہ زندگی اور ان ہزاروں درباریوں کیلئے اخراجات کہاں سے آئینگے۔ لوئی نے وہی کمزور فیصلہ کیا جو ہمارے حکمران آئے روز کرتے ہیں۔ لوگوں پر مزید ٹیکس لگا دیا گیا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، روزمرہ کی تکالیف سے عوام پریشان ہو چکے تھے۔ انہیں پتہ چلتا رہتا تھا کہ بادشاہ اور اسکے درباری کس شاہانہ انداز سے انکے پیسوں پر پل رہے ہیں۔ یہ نفرت کا لاوا تھا جو آہستہ آہستہ پک رہا تھا۔ مگر خونی انقلاب ابھی کافی دور تھا۔ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے برابر تھے۔ مگر چند سر پھرے لوگ بادشاہ اور درباریوں کی عیاشیوں کے قصے پمفلٹ کی صورت میں ہاتھ سے لکھ کر پورے ملک میں پھیلا دیتے تھے۔ عوام کی اکثریت کی صورتحال بالکل ایسی ہی ناگفتہ تھی جیسے ہمارے عام آدمی کی ہے۔ ہر طرف کرپشن اور لوٹ

مارکا دور دورہ تھا۔ درباری، گندم خرید کر ذخیرہ کر لیتے تھے اور پھر مہنگے داموں بیچتے تھے۔ شاہی خاندان اپنے درباریوں کی کاتاہیوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ حالات بگڑتے گئے۔ لوگ دانے دانے کو ترسنے لگے۔ لوئی XIV کی وفات تک کچھ نہ ہوا۔ مگر اسکے بعد آنے والے بادشاہ کو تھوڑا سا ادراک ہوا۔ اس نے شاہی اخراجات میں کمی کیلئے ایک عجیب سا فیصلہ کیا۔ اصطبل میں ہزاروں گھوڑے تھے۔ بادشاہ نے نصف شاہی گھوڑے مارکیٹ میں فروخت کر دیے۔ درباریوں نے اس شاہی فیصلہ پر خوب قصیدے کہے۔ بادشاہ کی دوراندیشی اور انصاف پسندی کی ہر طرف واہ واہ ہوئی۔ مگر وقت کے عظیم فرانسیسی فلسفی والٹیئر نے لوگوں کو کہا، کہ شاہی اصطبل سے گھوڑے بیچنے کی بجائے، بادشاہ اگر اپنے دربار سے انسانی صورت کے گدھے یعنی درباری باہر نکال دیتا، تو بہتر تھا۔ بادشاہ کو یہ شکایت پہنچی تو اس قدآور فلسفی کو ورسائلز کے دربار میں بلا کر پوچھا گیا کہ کیا اس نے درباریوں کو گدھا کہا تھا۔ والٹیئر نے کہا کہ یہ سچ ہے۔ چنانچہ اسے محل کے تہہ خانے میں ایک سال کیلئے قید کر دیا گیا۔ مگر اس دور کے لوگوں میں سے والٹیئر اور روسو جیسے بڑے لوگوں کے عظیم خیالات کو ختم نہ کیا جا سکا۔ یہ کہانی تقریباً ایک سو سال بعد انقلاب فرانس کے نکتہ پر ختم ہوئی۔ جس میں ورسائلز کے محل پر لوگوں نے دھاوا بول دیا۔ لوئی XVI کا دور تھا، شاہی درباری، بادشاہ، ملکہ اور اہم ترین لوگ خون میں نہا گئے۔ وہی چند ہزار شاہی درباری عوامی غضب سے برباد ہو گئے۔ قدرت کا انتقام دیکھیے کہ جس خاندان نے عوام سے پوشیدہ رہنے کیلئے محل بنوایا تھا، وہ اسی محل کی بدولت رزقِ خاک ہو گیا۔ وہ درباری جو اس محل میں شاہی خزانے پر جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے، انکا خون بھی زمین پر گرا۔ تمام درباری بھی گلاٹین کی نظر ہو گئے۔ وہ چند ہزار لوگ جو فرانس کی تباہی کی اصل وجوہات میں سے ایک تھے، انکا نام ونشان ہی مٹ گیا۔ فرانس نے ان ادنیٰ لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے بعد، دنیا میں حیرت انگیز طور پر ترقی کی۔ آج یہ ایک بین الاقوامی سطح کی طاقت ہے۔ حکومت عام لوگوں کے حقوق کی محافظ بھی ہے۔ فرانس نے شاہی جونکیں ختم کر ڈالیں اور یہی انکی ترقی کی بنیاد بنا۔

یقین فرمایئے۔ مجھے تین چار سو سال پہلے کے فرانس اور آج کے پاکستان میں محیر العقول مماثلت نظر آتی ہے۔ تہتر سال سے بنا ملک، اپنے غریب آدمی کی فلاح کیلئے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ ہم نے اپنی بے پناہ جہالت اور جذباتیت سے متعدد سیاسی شاہی خاندان پیدا کیے۔ ملک بننے سے لیکر آج تک اقتدار عوام کو منتقل نہیں ہوا۔ 1946 کے الیکشن کے اُمیدواروں کو دیکھیے۔ پنجاب اور سندھ کے اندر انگریزوں کی بنائی ہوئی یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے زمیندار، یک لخت مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ وہ بھانپ چکے تھے کہ تقسیمِ ہند بالکل نزدیک ہے۔ قائداعظم مسلمانوں کے عظیم الشان قائد بنکر اُبھرے تھے۔ چنانچہ انگریزوں کے پالتو طبلچیوں نے ایک دم مسلم لیگ میں شامل ہونے کو ترجیح دی۔ قائداعظم کی جلد وفات نے اصل اقتدار انہی لوگوں کو منتقل کر دیا۔ ان درباریوں کا عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں انہیں اشرافیہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ یہ موقع پرست، لالچی شعبدہ باز تھے، جو اقتدار کے ساتھ چمٹا رہنا چاہتے تھے۔ شائد نام لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ غلام محمد، سکندر مرزا، ممدوٹ وغیرہ کون تھے۔ آپ خود فیصلہ لیجئے۔ صدر ایوب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پاکستان میں صنعتی ترقی کا ڈول ڈالا گیا۔ یہ ترقی عوام تک کم کم پہنچی۔ وہی بائیس خاندان ظہور پذیر ہوئے جنکے پاس ملک کے اسی فیصد وسائل تھے۔ یہ ہرگز ہرگز معمولی سانحہ نہیں ہے۔ بنیادی طور پر دولت اور اقتدار عوام سے دور ہوتا گیا۔ پاکستان، صدیوں پرانے فرانس کے خطوط

پر روانہ ہوتا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو حد درجہ ذہین انسان تھا۔ عام لوگوں کے غم و غصے کو بھانپ گیا تھا۔ اسکی چند برس کی حکومت، لوگوں کیلئے قدرے عوام دوست تھی۔ مگر بھٹو بھی مالدار اور مضبوط طبقے کے ہاتھوں مار کھا گیا۔ 1970 کے الیکشن میں پی پی پی کے ٹکٹ ہولڈرز اکثر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جسکے خلاف بھٹو نے عملی ''جدوجہد'' کی تھی۔

مگر ہمارے ''محبوب صدر'' جنرل ضیاء الحق نے سیاست اور دولت کی نئی بساط بچھائی۔ یہ بساط آج تک یکسانیت کے ساتھ قائم ہے۔ اس ظالم نے انتہائی سفاکی سے پورے ملک سے چند خاندانوں اور مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے چند علماء پر نوازشات کی بارش کردی۔ اب دل تھام کر سوچیے۔ 1977 سے آج تک یہی دس بارہ ہزار لوگ ہیں جو جونکوں کی طرح لوگوں پر ہر طرح کا ظلم ڈھا رہے ہیں۔ یہ مکمل طور پر سرکاری خزانے کی پیداوار ہیں۔ انکا دین مذہب صرف اور صرف بادشاہ کے دربار میں مستقل طور پر رہنا ہے۔ المیہ یہ بھی ہے کہ یہ حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ لوگوں کو بیوقوف بنانے میں کامیاب ہیں۔ گزشتہ بیس پچیس برس کی سیاسی چالوں پر غور کیجئے۔ انتہائی بھونڈے طریقے کی نیم مردہ جمہوریت ہم پر نازل کردی گئی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہی گلاسڑا نظام ہمارے لیے ہر طور کا طریاق ہے۔ وہ خاندان جنہوں نے ملک کے معاشی نظام پر بھرپور قبضہ کرلیا ہے، ہمارے سیاسی مسیحا قرار دیے گئے۔ اَل شریف، زرداری، اور اسطرح کے لوگ ہمارے زمینی خدا بنائے گئے۔ مگر کہانی یہاں نہیں رُکتی۔ اسکے بعد اب انکے وہ حواری پیدا کیے گئے، جنہوں نے ان لوگوں کے شاہی دسترخوان سے دل بھر کر خوشہ چینی کی۔ آپ کسی بھی سیاسی جماعت کے اکابرین پر نظر ڈالیے۔ ان تمام کے تمام میں ایک صفت بالکل یکساں ہے۔ یہ ہر دور میں شاہی دربار سے منسلک رہے ہیں۔ ان لوگوں نے بے پناہ دولت کے بَل بوتے پر پاکستان کے ہر ادارے میں نقب زنی کی۔ ریاستی ادارے بھی انکے سامنے بے بس ہوگئے۔ نظامِ عدل سے لیکر بیوروکریسی اور ریاستی اداروں سے لیکر ہر اہم جگہ پر انہوں نے اپنے طفیلی مقرر کردیے۔ عوام مسلسل غربت کی چکی میں پستے رہے اور یہ چند ہزار شاہی درباری قیامت خیز ترقی کرتے گئے۔

حالیہ الیکشن میں بھی یہ کھیل انتہائی بھونڈے طریقے سے کھیلا گیا۔ پرانے شاہی درباریوں کو نئی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ عمران خان جسے 2018 تک عوام کی بھرپور تائید حاصل تھی۔ انہی پرانے طبلچیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ آج اسکی بطور وزیراعظم ساکھ حد درجہ کمزور ہوچکی ہے۔ وہ نیک نیت اکیلا آدمی اب نظام سے مات کھا رہا ہے۔ وہی چند ہزار لوگ اب اسکے اردگرد ہیں اور شاہی طعام و قیام سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تبدیلی کا نعرہ تقریباً معدوم ہوچکا ہے۔ عوام میں غم و غصہ حد درجہ موجود ہے۔ مگر تسلی رکھیے۔ ہمارا ملک فرانس جیسا نہیں ہے۔ یہاں کوئی والٹیئر موجود نہیں ہے۔ جو بادشاہ کو یہ بتانے کی جرات کریں کہ شاہی گھوڑے بیچنے کی بجائے، دربار سے گدھوں کو نکال دیا جائے، تو ملک ترقی کرسکتا ہے۔ ہمارے عوام بھی اپنی زبوں حالی کے خود ذمہ دار ہیں۔ ان میں انقلابی تبدیلی کی کوئی رمق موجود نہیں ہے۔ یہ تو بائیس کروڑ زندہ لاشیں ہیں جو صرف سانس لے رہی ہیں اور اسے زندگی سمجھتے ہیں۔ ہاں، ہمارے چند ہزار کے قریب لوگ اس ملک کے اصل مالک ہیں۔ اگلی کئی صدیوں میں بھی وہی قائم و دائم رہینگے۔ لہذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ عوام کا کیا ہے۔ یہ تو سانس لینے والے کیڑے مکوڑے ہیں۔ یہی دس ہزار جونکیں ہماری بربادی کی ذمہ دار ہیں اور ہمیں ان جونکوں کی عادت پڑ چکی ہے!

راؤ منظر حیات